قرآن اور فطری معرفت

قسط اول

استاد علی ربانی گلپائیگانی

ایران سے متعدد علمی اور تحقیقی مجلات شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے "کیھان اندیشہ" کو عالمی سطح پر خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے شمارہ ۲۷ میں "تفسیر و علوم قرآن" کے سلسلے میں آزاد اسلامی یونیورسٹی قم کے معروف استاد محقق اور فیلسوف جناب علی ربانی گلپایگانی کا ایک مفید مقالہ شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ جناب کوثر عباس حیدری اور جناب فدا بخاری صاحب نے کیا ہے۔ ذیل میں ہم اسے نذر قارئین کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

فطرت قرآنی مفاہیم میں سے ایک مفہوم ہے اور تفسیری بحثوں سے مربوط ہے۔ اسی لیے مفسرین نے آیت فطرت (روم۔ ۳۰) اور دوسری آیات جو اس مسئلہ کو بیان کرتی ہیں' پر بحث کی ہے۔ دوسری طرف احادیث اسلامی میں بھی مسئلہ فطرت کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اسی چیز نے احادیث کے شارحین کو بھی مسئلہ فطرت پر تحقیق کے لئے ابھارا ہے۔

تیسری جہت سے فطرت کی بحث ایک کلامی اور اعتقادی مسئلہ ہے اس لیے کہ مبداء اور معاد کے بارے میں بحث' کلامی بحثوں کا محور ہے اور برہان فطرت متکلمین کے براہین میں سے ایک برہان ہے' جسکی مدد سے وہ انسان کے مبداء اور معاد کی طرف میلان و رجحان کو ثابت کرتے ہیں۔ مغربی متکلمین بھی (خصوصاً عصر حاضر میں) اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور "تجربہ دینی" کے

عنوان سے جو بحثیں شروع ہوئی ہیں ان کا محور یہی مسئلہ ہے۔

قرآن کریم کی نظر میں' فطری معرفت' دو حوالوں سے انسانی وجود سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی جس کے دو سر چشمے ہیں۔ اس کا ایک مرکز "عقل" ہے اور دوسرا ہے "دل"۔ اس کے کئی نمونے قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ فطرت کے سرچشمے اور اس کے محرکات کو بھی بیان کیا گیا ہے نیز اس کی آفات اور اس پر آنے والی مصیبتوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہم مختصر انداز میں قرآن کی نظر میں حصول علم و معرفت کے ذرائع کے حوالے سے اور اس کے بعد فطری معرفت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہماری گفتگو مندرجہ ذیل عناوین پر ہو گی :

الف: قرآن کی نظر میں معرفت کے ذرائع **ب:** معرفت فطری کیا ہے ؟

ج: قرآن میں معرفت فطری کی مثالیں۔ **د:** فطری معرفت کیلئے آفتیں

ھ: فطری معرفت کا سرچشمہ اور اس کے محرکات۔

اب ہم ان مذکورہ عناوین پر تفصیلی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

الف :۔ قرآن کی نظر میں علم و معرفت کے ذرائع

قرآن کریم نے علم و معرفت کی ان تمام عمومی ذرائع کی تائید کی ہے جو انسانی معاشرے میں رائج ہیں اور خود بھی معرفت کے ایک ذریعے (جو دیگر تمام ادیان الٰہی میں بھی قبول شدہ ہے) کو پیش کیا ہے اور وہ ذریعہ "وحی" ہے بنا برایں قرآنی نظر میں کسب معرفت کی راہیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حواس (۲) دل و فطرت (۳) عقل و خرد (۴) وحی

اب ہم ان سب کے بارے میں قرآنی آیات پیش کرکے اختصاراً ان کی وضاحت کریں گے تاکہ معرفت فطری کے حوالے سے بحث بالکل واضح ہو جائے۔

۱۔ حواس کے ذریعے: قرآن کریم نے اس کے حوالے سے دو حسوں بینائی اور شنوائی (یعنی دیکھنے کی قوت اور سننے کی حس) کا خصوصی ذکر کیا ہے اور ان دونوں کو انسان کیلئے کسب معرفت کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ ان آیات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جن میں دونوں حسوں کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری قسم ان آیات کی ہے جن میں ان دونوں میں سے ہر ایک کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل آیات زیادہ واضح ہیں:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

خدا نے تمہیں اس حال میں تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے پیدا کیا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور تمہارے کان' آنکھیں اور دل بنایا تاکہ تم شکر ادا کرسکو۔ (۱)

وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْشَاَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیلاً مَا تَشْکُرُوْنَ

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل تخلیق کئے لیکن تم اس کا کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔ (۲)

سورہ ملک کی آیت نمبر ۲۲ میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح سورہ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیلاً مَاتَشْکُرُوْنَ

اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل تخلیق کئے (تاہم) تم میں سے کم ہی شکر ادا کرتے ہیں۔ (۳)

لفظ "سمع" کبھی تو بمعنی "قوت سماعت" کے استعمال ہوا ہے، کبھی بمعنی "کان" کے۔ اور کبھی بمعنی "سنے جانے" کے (۴)۔ یہ لفظ قرآن میں ہر جگہ مفرد ہی استعمال ہوا ہے جبکہ کلمہ بصر عموماً جمع استعمال ہوا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کانوں سے جو چیز سنی جاتی ہے وہ محض آواز ہے لیکن قوت بینائی سے ہم شکل وصورت، رنگ، طول وعرض وغیرہ بھی دیکھ سکتے ہیں اور شاید عمل شنوائی اور عمل بینائی میں یہی وحدت و کثرت لفظوں کے ظاہری اختلاف کا سبب بن گیا ہو۔ (۵)

واضح سی بات ہے کہ قرآن کریم نے چونکہ قواء حسی کو کسب معرفت کا وسیلہ وذریعہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان ذرائع سے حاصل ہونے والی معرفت کو بھی میسر سمجھتا ہے۔ اس بنا پر نظریہ نفی معرفت (یعنی معرفت کی کوئی حقیقت نہیں ہے) جسے سو فسطائی اور شکا کان پیش کرتے ہیں، ناقابل قبول ہے۔
حس شنوائی میں ایک نکتہ جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ جب بھی انسان اپنے دینی یا دنیاوی مسائل میں ماہر یا سپیشلسٹ نہ ہو تو اس شعبے کے ماہرین کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اس لیے قرآن کریم میں کبھی صرف دو حسوں یعنی قوت سماعت و عقل ہی کو ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِی ذَالِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہُ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ ھُوَ شَھِیْدٌ

وہ حقائق جو ہم نے بیان کئے ان میں درس عبرت ہے اس کے لیے جو صاحب تعقل و تفکر ہے یا سننے والے کان رکھتا ہے اور توجہ دیتا ہے۔ (۶)

نیز ایک مقام پر دوزخیوں کی بات کی حکایت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

" لَوْکُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِی اَصْحَابِ السَّعِیْرِ " (۷)

اگر ہم نے کان دھرے ہوتے یا ہم نے عقل استعمال کی ہوتی تو آج دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔ (۸)

۲۔ عقل و خرد :۔ قرآن کے وہ الفاظ جو اس ذریعہ اور وسیلہ معرفت کو بیان کرتے ہیں وہ ہیں: تفکر،

تعقل، لب، قلب اور فواد۔ پہلے دو الفاظ معرفت اور حصول علم کے عمل اور انجام دہی کو بیان کرتے ہیں جب کہ باقی حصول معرفت کی راہوں اور ذرائع اور وسائل کو بیان کر رہے ہیں۔

فکر ایسی قوت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان معرفت تک پہنچ سکتا ہے اور تفکر کہتے ہیں عقل کی مدد سے اس قوت کو کام میں لانا۔ (۹) قرآن کریم میں ایسی آیات بہت ساری ہیں جن میں اہل فکر کی تعریف کی گئی اور جو فکر سے کام نہ لینے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ عقل کسب علم کے لئے ایک قوت ہے اور کبھی اسے اس علم و دانش پر بھی بولا جاتا ہے جو عقل کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

حدیث رسولؐ میں آیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے عقل سے بڑھ کر گرامی قدر اور قیمتی چیز کوئی نہیں پیدا کی۔" نیز ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: "عقل سے بڑھ کر خدا نے ایسی کوئی چیز پیدا نہیں کی جو ہدایت کیلئے انسان کی راہنمائی کرے اور اسے گمراہی سے روکے۔"

پہلی حدیث عقل کے پہلے معنی کو بیان کررہی ہے اور دوسرے حدیث عقل کے دوسرے معنی کو بیان کر رہی ہے۔ (۱۰) ایسی بھی بہت ساری آیات ہیں جو یہ بیان کرتی ہیں کہ حق اور باطل کے درمیان تشخیص کیلئے عقل سے استفادہ کیا جائے۔

لب :۔ اس عقل کو کہتے ہیں جو شائبوں سے پاک اور قوت ادراک سے آراستہ ہو۔ بنا بر ایں "لب" عقل کے معنی سے اخص اور محدود ہے یعنی ایک خاص مفہوم کے لیے استعمال ہوا ہے اور عموماً جن آیات قرآنی میں استعمال ہوا ہے وہاں لطیف معانی و حقائق کی طرف اشارہ ہے۔ (۱۱) قبل اس کے کہ ہم "قلب اور فواد" دو لفظوں کی وضاحت کریں، مذکورہ تین الفاظ کے متعلق قرآنی آیات ذکر کرتے ہیں

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِ عِنْدَاللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ

خدا کے نزدیک بدترین جاندار وہ گونگے اور بہرے لوگ ہیں جو تعقل نہیں رکھتے۔ (۱۲)

ويجعل الرجس على الذين لا يعقلون

خدا نجاست ان لوگوں پر قرار دیتا ہے جو سوچتے نہیں ہیں۔ (۱۳)

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

خدا اسطرح کی نشانیاں تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم تفکر کرو۔ (۱۴)

اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الْبَابِ

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل مندوں کیلئے نشانیاں ہیں۔ (۱۵)

قرآن میں "قلب"

قرآنی آیات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ لفظ "قلب" درج ذیل مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے:

۱ : دل یا ایک ایسا مرکز جس میں درج ذیل صفات ہوتی ہیں: اطمینان، خوف، سکون یا نرمی، میلان، حسرت، قساوت، الفت، خشیت، کینہ یا اس طرح کی دوسری صفات۔ متعدد آیات میں انہیں قلب کی صفات کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

۲ : عقل و فہم :۔ قرآن کی بعض آیات میں قلب بہ معنی عقل و فہم استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَن کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ

بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جس کا دل (بیدار) ہو یا کان لگائے اور وہ متوجہ ہو۔ (۱۶)

جیسے کہ ہم اس سے پہلے تذکرہ کر چکے ہیں کہ اس آیت میں نیکی اور بدی کی باہمی تشخیص اور مصلحت ومفسدہ اور نفع ونقصان کی تشخیص کیلئے دو ذریعے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک قوت عقل وخرد سے استفادہ اور دوسرا دوسروں کی مہارت سے استفادہ جو کسی کی باتوں کو غور سے سننے کی نتیجے میں ہوتا ہے۔

نیز ارشاد ہوتا ہے **لھم قلوب لا یفقھون بھا** (۱۷) یہاں اس آیت میں بھی قلوب سے مراد عقل و خرد ہے کہ گمراہ لوگ حقائق الٰہی کو سمجھنے کے لیے اس سے استفادہ نہیں کرتے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اَفَلَم یَسِیْرُوا فِی الاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوبٌ یَّعقِلُوْنَ بِھَا

کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں جو ان کے دل (ایسے) ہو جاتے کہ ان سے سمجھنے لگتے۔ (۱۸)

واضح سی بات ہے کہ تعقل، عقل و خرد کی قواء کو استعمال میں لانے کا نام ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ القُرآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْفَالُھَا

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا پھر کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ (۱۹)

اس آیت میں ''قلب'' سے مراد عقل و خرد ہی ہے۔ ''تدبر'' کے قرینے کی وجہ سے جس کے معنی ''تفکر'' کے ہیں۔

۳ : بعض آیات میں قلب کے لیے ایسی صفات کا تذکرہ ہے جو عقل پر بھی صادق آتی ہیں اور دل پر بھی۔ جیسے ہدایت، تقویٰ، پاکیزگی، مہر لگ جانا، سیل ہو جانا، مشتبہ ہو جانا، انحراف، خیر، غفلت، آلودگی گناہ، وغیرہ وغیرہ۔

۴ : کبھی لفظ قلب سے مراد انسان کی روح ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ

جب ان کی جانیں حلق تک پہنچ جائیں۔ (۲۰)

اور اسی طرح فرمایا:

وَاذَ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرَ كَاظِمِيْنَ

جب غم سے جانیں حلق تک پہنچ جائیں۔ (۲۱)

راغب فرماتے ہیں لفظ قلب ان امور میں استعمال ہوتا ہے جو انسان سے مختص ہیں۔ جیسے روح، انس، شجاعت، وغیرہ۔ جیسا کہ ارشاد ہے کہ وبلغت القلوب الحناجر یہاں قلوب سے مراد ارواح ہیں اور ارشاد ہے: ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان لہ قلب۔ یہاں قلب سے مراد علم و فہم ہے۔ نیز ارشاد ہے: ولتطمئن قلوبکم یعنی تاکہ تمہاری شجاعت محکم ہوجائے اور خوف تم سے جاتا رہے۔ (۲۲)

علامہ طباطبائی نے آیہ "بما کسبت قلوبکم" (۲۳) میں قلوب کی تفسیر "روح و نفس" کی ہے۔ اس لیے کہ کسب واکتساب کی نسبت انسان کے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں دی جاتی۔ اس کا مبتداء درحقیقت انسان کا نفس اور اس کی روح ہی ہے۔ (۲۴) شیخ محمد عبدہ بھی کہتے ہیں کہ لفظ "قلب" وجدان، عقل، اور نفس ناطقہ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا استعمال "وجدان" کے معنی میں زیادہ ہے۔ کیونکہ "یقین" اور "ایمان" اسی سے مربوط ہے۔

قرآن میں لفظ "فواد"

ان تمام آیات کے مطالعے سے جس میں لفظ "فواد" اور "افئدہ" استعمال ہوا ہے، پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ دو ادراکی اور حساساتی خصلتوں کو بیان کرتا ہے۔ ایک عقلائی ادراک اور دوسرا باطنی ادراک جسے وجدانی ادراک یا ضمیر خود آگاہ بھی کہتے ہیں۔

وہ آیات جن میں معرفت کے ذرائع بیان کئے گئے ہیں ان میں کانوں اور آنکھوں کے بعد "فواد" آیا ہے۔ یہ اس بات کا شاہد ہے کہ فواد سے مراد عقل و خرد کی طاقت ہے۔ جیسا کہ بعد کی آیات میں فواد ثابت قدمی، اطمینان، آرام وسکون، فراغت جیسی صفات کے ساتھ بھی آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ كُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ

ہم تم سے رسولوں کے احوال بیان کرتے ہیں تاکہ اس سے تمہارے دل کو تسلی دیں۔ (۲۶)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوسٰى فٰرِغًا

موسیٰ کی ماں کا دل ہر چیز سے لاتعلق ہوگیا (سوائے اپنے بیٹے کے)۔ (۲۷)

باالفاظ دیگر فواد سے مراد قلب اور انسان کا نفس اور اس کی روح ہی ہے۔ منطقیوں کی اصطلاح کے مطابق یہ انسان کی فصل ممیّز ہے۔ اس حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو ہے تفکر اور سوچ بچار اور دوسرا ہے احساس اور باطنی شہود۔دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں علم و معرفت اور ادراک کا ذریعہ ہیں۔

دل اور باطن کے ذریعے

قرآن مجید میں قلب اور فواد کے مفہوم کے بارے میں جو وضاحت کی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ کبھی ان دو لفظوں سے مراد دل اور انسان کا باطن نیز وجدان کے ذریعے حقائق کا ادراک کرنا بھی ہوتا ہے۔ ماہرین علم نفسیات جس چیز کو انسان کے اعلیٰ باطنی رجحانات کہتے ہیں وہ ادراک کی یہی قسم ہوتی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق روحانی تجربات نے ثابت کیا ہے کہ انسان کے اندر اور باطن میں کچھ رجحانات ودیعت کئے گئے ہیں جیسے انسان کا علم کی طرف رجحان (یعنی حقیقت کو پانے کی حس) نیکی کی طرف رجحان (جو اخلاقی حس ہے)' جمال و زیبائی کی طرف رجحان (جو حسن پسندی کی حس ہے) اور تقدس کی طرف رجحان (جو مذہبی حس ہے)۔ اگرچہ ان رجحانات کے کم یا زیادہ ہونے میں انسانوں میں باہم فرق ہے لیکن ان احساسات اور رجحانات کے موجود ہونے کے حوالے سے تمام انسان برابر ہیں۔ یہ رجحانات فطری رجحانات ہیں اور نتیجتاً کسی حد تک علم و معرفت اور شناخت کا باعث بنتے ہیں۔ جہاں ان میں اضافے اور کشش کی خصوصیت موجود ہے' وہاں یہ علم و ادارک کی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ دو طرح سے جلوہ نما ہوتے ہیں۔

(الف) فطرت کے ذریعے

فطرت باطن کا ایک اہم جلوہ ہے جس کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ سورہ الشمس کی آیات اسی مفہوم کو بیان کر رہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ نَفْسٍ وَ مَاسَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا

نفس کی قسم اور اس کی قسم جس نے اسے آراستہ کیا ہے اور پھر فجور اور تقوی کا اسے الہام کر دیا ہے۔ (۲۸)

یہ جلوہ دل اور باطن سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کوئی ایسا انسان بھی جو صحیح الخلقت ہو وہ اس سے محروم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حجت الٰہی سب لوگوں پر تمام اور مکمل ہے' جس کی تفصیل عنقریب آ رہی ہے۔

(ب) کشف و شہود کے ذریعے

باطن کا دوسرا جلوہ مکتب عرفان و تصوف کے مطابق کچھ روحانی اور نفسانی ریاضتوں اور مشقوں کے ساتھ مشروط ہے۔ البتہ اس کے کئی درجات اور مراتب ہیں۔ درجات اور مراتب اللہ کے خاص اولیاء کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں ہوتے۔ یہ راہ دشوار شرائط کی بدولت بہت محدود ہے اور انسانوں میں سے بہت کم لوگوں کو ان راہوں پر چلنے کی توفیق ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس راہ پر چلے تو یہ کیفیت کے لحاظ سے حس و عقل سے برتر ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس راہ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ہم چند آیات پیش کرتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہماری راہوں کے لئے کوشش کرتے ہیں ہم اپنی راہوں کی طرف (خصوصی طور پر) ان کی ہدایت کرتے ہیں۔ (۲۹)

سورہ طلاق میں ارشاد ہے:

وَ مَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجاً وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

جو کوئی تقویٰ الٰہی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے سختیوں سے نکلنے کے لئے راستہ بنا دیتا ہے اور جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا اسے روزی دیتا ہے۔ (۳۰)

(آیت مطلق ہے اور اس اطلاق مادی اور معنوی دونوں طرح کا رزق شامل ہو جاتا ہے۔)

سورہ انفال میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَاناً

اے ایمان لانے والو! اگر پرہیز گار بنو گے تو خدا تمہیں حق و باطل کے درمیان تشخیص کی طاقت عطا کرے گا۔(۳۱)

۴۔ وحی کے ذریعے

اگر عربی لغت کے ماہرین کی لکھی ہوئی کتابوں کی طرف رجوع کریں تو لفظ وحی کے بارے میں جو وضاحت دی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وحی تعلیم کی خاص قسم ہے جو ایک تو نہایت ہی سرعت اور برق رفتاری سے انجام پاتی ہے اور دوسرا مخفی ہے۔ ابن فارس کہتے ہیں وحی مخفی تعلیم کو کہتے ہیں۔ (۳۲) راغب کہتے ہیں وحی اشارہ سریع کو کہتے ہیں۔ (۳۳) اس لئے وحی میں مفہوم کو رمز اور تیز ترین اشارے سے پہنچایا جاتا ہے۔ عربی زبان کے ان دو معروف لغت شناسوں نے اس لفظ کی دو خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک نے وحی میں "سرعت انتقال" کی طرف اور دوسرے نے اس کے مخفی ہونے کی طرف۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں خصوصیات بیک وقت وحی میں موجود ہیں اور جہاں

کہیں بھی لفظ وحی استعمال ہوا ہے اس کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اب ہم قرآن میں لفظ وحی کے استعمال کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

۱۔ وحی بمعنای طبعی ہدایت :۔ یعنی ایسے قوانین جو موجودات دنیا کی زندگی پر حاوی ہیں جنہیں فطری قوانین کہتے ہیں۔ جیسے سیاروں کی حرکت، اشیاء کی طبعی ترکیبات اور ان کے آثار اور خواص (جیسے آگ کا جلانا) چنانچہ آسمان میں حاکم فطری نظام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اَوحٰی فِی کُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَھَا

اور اس نے ہر آسمان میں اس کے امور کی وحی کی۔ (۳۴)

یہ آیت اس بات پر شاہد ہے کہ اس آیت میں وحی سے مراد فطری قوانین اور دستور ہیں جو آسمانوں پر حاکم ہیں۔ آیت کے آخر میں یوں ہے۔

ذٰلِکَ تَقْدِیرُ الْعَزِیزُ الْعَلِیْمِ

یہ ہے غالب اور علیم ذات کا ہر چیز کے متعلق ایک خاص مقدار کا تعین کرنا۔ (۳۵)

۲۔ جانداروں اور خصوصاً" حیوانات کی ایک مخصوص جبلت (یا سرشت) کے ذریعے ادراک مثلاً" شہد کی مکھی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ اَوحٰی رَبُّکَ النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِی مِنَ الْجِبَالِ بُیُوتاً" وَ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ

پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کی (یعنی یہ بات سکھائی) کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں کی بلندیوں پر چھتہ بنائے۔ (۳۶)

۳۔ وحی بمعنی "القاء در دل" جو صرف انسان ہی سے متعلق ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ جب بھی دل پاکیزہ ہو تو خدا کیطرف سے کچھ مفاہیم اس پر القاء ہوتے ہیں اور اگر ناپاک ہو تو شیطان کی طرف سے اس پر القاء ہوتے ہیں پہلی قسم کے متعلق ارشاد ہے:

وَ اَوحَیْنَا اِلیٰ اُمِّ مُوْسیٰ اَنْ اَرضِعِیهِ...

ہم نے مادر موسیٰ کو وحی کی (یعنی اس کے دل پر القاء کیا) کہ اپنے بیٹے کو دودھ پلاؤ۔ (۳۷)

ایک دوسری جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاک سیرت اصحاب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِذْ اَوحَیْتُ اِلیَ الحَوارِیِّنَ اَنْ اٰمِنُوابِی وَ بِرَسُولِی

ہم نے عیسیٰ کے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسولؑ پر ایمان لاؤ۔ (۳۸)

حضرت یوسفؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ اَوْحَیْنَا اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ

ہم نے یوسف کی طرف وحی کی کہ آپ اپنے برادران کی کارگزاریوں کے متعلق انہیں

ضرور آگاہ کریں گے لیکن وہ آپ کو نہیں پہچان پائیں گے۔ (۳۹)

دوسرے کے حوالے سے (یعنی وحی شیطانی کے حوالے سے) ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِنَّ الشَّیَاطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیَآءِھِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ

بے شک شیاطین اپنے ساتھیوں کی طرف وحی کرتے ہیں کہ تم سے مجادلہ (جھگڑا) کریں۔ (۴۰)

ظاہر ہے کہ دل میں القاء جب بھی خدا کی طرف سے ہو اس کا "دل کی راہ" یعنی کشف و شہود کے ذریعے سے کسی چیز کے حاصل کرنے کے ساتھ چنداں فرق نہیں ہے۔ دونوں یعنی القاء اور کشف و شہود تقریباً ایک ہی ہیں۔ اس لئے کہ نفس کی ریاضتیں اور پرہیز گاری دل کے آئینے کی نجاست کو زنگ سے پاک کرتی ہیں اور حقیقت کا چہرہ اس میں نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت انسان کے باطن میں ایک روشن معرفت کی صورت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

۴۔ وحی نبوت

وحی کی یہ قسم مخصوص ہے پیغمبروں کے لئے، چاہے صاحب شریعت پیغمبر ہوں یا نہ ہوں، جیسے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور پیغمبر گرامی آخر الزمان اور دیگر پیغمبران خدا

وحی نبوت سے مربوط آیات بے شمار ہیں نمونے کے طور پر، اور بات کو واضح کرنے کے لئے ہم صرف ایک آیت کا ذکر کرتے ہیں۔

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہٖ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ ھٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ

ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسا کہ ہم نے نوح اور اس کے بعد آنے والے انبیاء کی طرف وحی کی۔ اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق یعقوب اور ان کی اولاد اور عیسیٰ، اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی۔ (۴۱)

پیغمبران الٰہی پر جو چیز وحی ہوئی اس کا تعلق الٰہی معارف، عملی احکام، اخلاقی قوانین، تاریخی واقعات، اخروی زندگی اور اس طرح کے دیگر مسائل سے تھا جو سب معنوی ہدایت کی خاطر اور بشر کی تربیت اور رشد، اور اس کی بلندی کی خاطر وضع کئے گئے جس کے نتیجے میں عام انسان انسان کے بارے میں مہم معارف کائنات کی مخلوقات اور جہان کے متعلق اہم معارف حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تاکہ اپنی ہر حسی اور عقلی معرفت کو کمال تک پہنچائے اور پھر اعلیٰ دینی تعلیمات کے تقاضوں کے مطابق ہدایت پائے۔

معرفت فطری کسے کہتے ہیں

لفظ فطرت، مخلوق کی ایک خاص نوع پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ اس کا وزن "**فعلة**" ہے

جو مصدر نوعی کہلاتا ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فعل کس طرح (یا کس نوع کا) سرانجام پایا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ جلست جلسة الامیر میں امیر کی طرح بیٹھا

ابن اثیر کہتے ہیں "کہ فطر بر وزن دھر ہے جس کا معنی ابتداء کرنا اور ایجاد کرنا ہے۔ اور فطرت اس کی حالت کو بیان کرنا ہے یعنی (فلاں کام) کس طرح ہوا۔ اور اس حدیث نبوی سے مراد جس میں ارشاد فرمایا کل مولود یولد علی الفطرة اس کا مفہوم یہ ہے کہ سرشت اور فطرت باقی رہے تو کبھی بھی دین کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے گا۔ اور خارجی عوامل کی بناء پر دین سے عدول کر جانے کی مثال تقلید کی طرح ہے۔ حضرت ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ آپؓ نے فرمایا ہے کہ اس آیت فاطر السمٰوات والارض کا معنی مجھے معلوم نہ تھا یہاں تک کہ ایک کنویں پر دو اعرابی میرے سامنے جھگڑ پڑے۔ ان میں سے ایک نے کہا انا فطرتها پہلے میں نے اس کو کھودا ہے پس مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ فطر کا معنی ہے کسی چیز کو ایجاد کرنا (۴۲) بنا برایں خدا کی طرف سے کائنات کی تخلیق اسی طرح کی ایجاد ہے اور اسکی طرف سے اسےوجود بخشا گیا ہے ایک تو اس لئے کہ خدا نے عالم کو عدم سے وجود دیا ہے اور پھر اسے اس "مادے" سے اس کی ترکیب اور صورت گری کی ہے جیسے بھی خلق کیا خود ہی خلق کیا۔ جبکہ وہ صورت کشی جو غیر خدا کی طرف سے انجام پاتی ہے۔ اس مادے (یا مواد سے ہوتی ہے جو خدا ہی کا خلق کردہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ دنیا کی ترکیبی ہیت کا نقشہ بھی اسی کا ایجاد کردہ ہے اور تخلیق کردہ ہے۔ جو قبل ازیں نہ تھا یعنی خدا نے کسی اور سے اسے اخذ نہیں کیا۔ جبکہ غیر خدا جو کچھ بھی جانتا ہے وہ خود خدا ہی کی طرف سے (دی گئی عطا) ہے۔

قرآن کریم نے جہان تمام موجودات کی خلقت میں "فطرت" کو استعمال کیا ہے اور خدا کو فاطر السموات والارض قرار دیا ہے۔ وہاں خود انسان کے متعلق مخصوص فطرت کی بات بھی کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

دین حنیف پر قائم رہو۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو فطرت الٰہی کے تقاضوں کے مطابق ہے وہی فطرت جس پر انسانوں کی تخلیق کی گئی ہے۔ خدا کی تخلیق میں ردو بدل ممکن نہیں۔ یہ دین انسانی سعادت اور اس کی تکمیل کا ذمہ دار ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۴۳)

یہ آیت واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان خصوصی تخلیق رکھتا ہے جس کے سبب وہ دوسرے جانداروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصی تخلیق، دین ہی کے ذریعے اپنا وجود اور

شکل اختیار کرتی ہے۔ وہ دین جس کی بنیاد خود انسان کی سرشت میں اور اس کی تخلیق میں موجود ہے اور اس کے وجود کے پیکر اور زندگی کے پہلوں کیساتھ ہم آہنگ ہے اور وہی دین اسلام ہے۔ یعنی خدا اور اس کے فرامین کے سامنے سر تسلیم خم کرنا جیسا کہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ

خدا کے نزدیک دین' اسلام ہے۔ (۴۴)

مَنْ یَبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُقْبَلَ مِنْہُ

جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اختیار کرے گا تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ (۴۵)

اور چونکہ اس دین کی اساس اور حقیقت توحید ہے اسی لئے روایات میں دین فطری کی تفسیر "توحید" کی گئی ہے۔(۴۶) بنا برایں فطرت اگر طبیعت اور بے جان موجودات اور نباتات میں استعمال ہو یا فطرت بمعنی سرشت یا جبلت جن کا تعلق جانداروں کی دنیا سے ہے' میں استعمال ہو تو اس لحاظ سے ہے کہ چونکہ یہ سب تکوینی اور تخلیقی ہیں اور قلم آفرینش نے سب کو تخلیق کیا ہے اس لحاظ سے فطرت تقریباً" سب میں ایک ہی معنی میں ہو گی۔ لیکن انسانی حوالے سے دیکھیں تو انسان میں ایک خصوصیت شمار ہوتی ہے لھذا دوسروں (میں فطرت کے مفہوم) سے تفاوت رکھتی ہے۔

طبعاً" اس خصوصیت کو انسانی کی عاقلانہ زندگی میں تلاش کیا جائے۔ کیونکہ دین بھی اسی آسمانی عنصر سے مربوط ہے۔ یعنی عنصر عقل و خرد جو خوبی کو بدی سے تمیز دیتا ہے اور حقائق کے ادراک اور کلی اقدار سے طاقت ور ہے اور فلسفی تعبیر کے مطابق فطرت کا جبلت سے یا سرشت سے باہمی فرق "تشکیلی" تفاوت ہے کہ جس کا تعلق وجود کے کمال اور نقص کی طرف پلٹتا ہے۔

نظری اور عملی فطریات: جو انسان کی فطرت اور سرشت کاتقاضا ہے وہ دو طرح کا ہے۔ بسا اوقات اس کی معرفت "بالفعل" مستحق ہوتی ہے جیسے انسان کا اپنے بارے میں وجدانی ادراک اور کبھی اس کا مستحق ہونا (یا وقوع پذیر ہونا) "بالقوہ" ہوتا ہے۔ یعنی انسان اس کی صلاحیت یا استعداد رکھتا ہے جیسے انسانی کمالات جو علم و عمل کے ذریعے انسان حاصل کرسکتا ہے۔

فی الحال ہماری گفتگو پہلے سے متعلق ہے جسے انسان کی تخلیق اور اس کے باطن کا سرمایہ کہنا چاہیے۔ اس فطری سرمائے کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک نظری اور دوسرا عملی' نظری فطریات ان بدیہی اور واضح ادراک کو کہتے ہیں جو براہ راست عمل و کردار سے تعلق نہیں رکھتے۔ مثلا مفاہیم کاادراک' ضروری احکام کا ادراک' اسی طرح امکان' امتناع' تناقض وغیرہ کا ادراک لیکن عملی فطریات ان بدیہی ادراکات کو کہتے ہیں جو براہ راست عمل وکردار سے مربوط ہیں مثلا نیکی اور اچھائی کا ادراک' شکر منعم بجا لانے کا ادراک' عدل و انصاف' صدق و سچائی' عہد پیمان کی وفا' احسان کا بدلہ

احسان' ناشکری اور کفران نعمت کے قبیح ہونے کا ادراک'ظلم'وستم'جھوٹ' خیانت'پیان شکنی' اور نیکی کے بدلے بدی کرنا اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے قبیح ہونے کا ادراک

اب ہم اس بارے میں گفتگو کریں گے کہ فطرت کے ان دو سرمایوں کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے۔

ج :۔ قرآن پاک میں معرفت فطری کی مثالیں

ا۔ انسان اور خود آگاہی

انسان کی فطری معرفتوں میں سے ایک خود آگاہی ہے۔ یعنی انسان اپنے صفات اور حالات کے متعلق آگاہ ہے۔ اگرچہ یہ عین ممکن ہے کہ بعض مصلحتوں کی بنا پر بعض خاص اغراض کی بنا پر ان کے اظہار یا اقرار یا تسلیم سے انکار کردے۔ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے

بَلِ الاِنسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْاَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ

بلکہ انسان اپنے آپ کے بارے میں آگاہ ہے اگرچہ عذر تراشی کرے۔ (۴۷)

اگرچہ یہ آیات' اس سے پہلے والی آیات کے سیاق کے مطابق قیامت اور مابعد قیامت کے بارے میں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو اس کے کیئے گئے اعمال کے متعلق آگاہ کیا جائے گا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ انسان نے جو کچھ عمل کیا ہے اور جو کچھ انجام دیا ہے اس کے متعلق آگاہ ہے اس کو اس کے اعمال کے متعلق بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں لیکن یہ بات آیت کے عمومی معنی اور مدلول سے مانع نہیں بنتی خصوصا" وہ احادیث جو آئمہ طاہرین سے مروی ہیں کہ جن میں ان آیات کو دوسرے مقامات پر بھی منطبق کیا گیا ہے طبرسی نے مجمع البیان میں زرارہ سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت جعفر صادق(ع) سے اس بیماری کی حد پوچھی جو مجوز افطار ہے۔ تو امام(ع) نے یہ آیت تلاوت فرماتی بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ اور فرمایا وہ اپنی طاقت وتوانائی کے متعلق بہتر جانتا ہے لہذا اس کی تشخیص کامعاملہ خود اس کے سپرد کردیا جائے۔ (۴۸)

۲۔ انسان اور خدا خواہی

قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ خدا پرستی انسانی فطری رجحانات میں سے ہے اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس فطری محبت کو غیرخدا کی طرف بھی لے جائے۔ یعنی غیر خدا کو خدا کی جگہ لے آئے۔

انہی آیات میں سے ایک سورہ بقرہ کی آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ

بعض لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو محبوب بنائے رکھتے ہیں اور ان سے یوں محبت

کرتے ہیں جیسے اللہ سے کی جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ خدا سے شدید محبت کرتے ہیں۔ (۴۹)

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں کچھ ایسے میں جو صرف خدا کو دوست رکھتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غیر خدا کو خدا کی جگہ دوست رکھتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہر دو قسم کے لوگ درحقیقت خدا کو دوست رکھتے ہیں البتہ اس فرق کیساتھ کہ ایک گروہ (یعنی کافروں اور مشرکوں نے) وہ جو خدا نہیں ہیں' خدا کا لبادہ پہنا رکھا ہے اور (ان کو خدا بنا کر) ان سے محبت رکھتے ہیں اور دوسرا گروہ (مومنین) خود خدا سے شدید محبت کا اظہار کرتا ہے۔ پس اگر ان دونوں میں فرق ہے تو دراصل محبوب کے مصداق میں ہے نہ کہ کمال مطلق کی نسبت' اصل حب میں۔

ایک دوسری آیت جو اس مفہوم پر دلالت کرتی ہے وہ آیت ہے جس میں حضرت ابراھیمؑ نے بت پرستوں پر اتمام حجت کی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ

جب رات ہوگئی تو انہوں نے ستارہ دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے؟ اور جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۵۰)

حضرت ابراہیمؑ نے اس آیت میں اپنی محبت کو استدلال کی " بنیاد " قرار دیا ہے اور یہ استدلال اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب مشرکوں کے ضمیر کے اندر بھی معبود سے محبت موجود ہو یہ اور بات ہے کہ وہ محبوب کی تشخیص میں اشتباہ اور غلطی کر رہے ہوں۔ لھذا حضرت ابراہیم نے ستارے کے ڈوب جانے کی دلیل دے کر اس کی ناپائیداری اور ابدی نہ ہونے کی دلیل دی ہے' مشرکوں کے مصداق میں اشتباہ کو واضح کیا ہے۔

علم منطق کے اصول کے مطابق یہ استدلال اس طرح ہوگا۔

۱۔ میں رب وپروردگار کو دوست رکھتا ہوں۔ ۲۔ میں اس چیز کو جو ڈوب جائے اور جاوداں نہ ہو دوست نہیں رکھتا۔ ۳۔ پس جو ڈوب جائے میرا پروردگار نہیں ہے استدلال کے پہلے دو مقدمے انسان کے فطری بدیہیات سے ہیں۔

انسان جو پروردگار سے محبت رکھتا ہے وہ اس بنا پر ہے کہ وہ اپنی سعادت کو اس کی عنایت اور تدبیر امور میں منحصر سمجھتا ہے یعنی وہی اس کو نفع پہنچا سکتا ہے اور وہی اس سے ضرر کو دور کرسکتا ہے تو جو ناپائیدار ہے' اپنی ناپائیداری کے پیش نظر وہ انسانی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کراسکتا۔ مگر یہ کہ وہ غیر طبیعی یا غیر فطری ماحول اور اسباب میں گھر جائے اور یہ ہمارے فرض سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ قرآن کریم انسان کو ظاہری دنیاوی زندگی سے وابستہ ہونے سے ڈراتا ہے وہ اسے شائستہ نہیں سمجھتا۔ اور اسے خدا کی رضا کے حصول اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ

جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ (۵۱)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ

جو خدا کے پاس ہے بہترین اور پائیدار ہے۔ (ہمیشہ باقی رہنے والا) (۵۲)

بنابرایں حضرت ابراہیم کی کلام کا ماحصل جس میں ارشاد فرمایا "انی لا احب الآ فلین" یہ ہے کہ وہ چیز جیسے زوال اور دگر گونی کا خطرہ ہو اور اس میں ثابت قدمی اور استقرار نہ ہو وہ اس لائق نہیں کہ اس سے دل بستہ ہوا جائے جبکہ حکم عقلی و فطرت کے مطابق واجب ہے کہ انسان اپنے پروردگار سے محبت رکھے پس ستارہ اوراس قسم کی دوسری چیزیں جو فنا اور زوال کے خطرے سے دوچار ہیں شائستہ مقام ربوبیت نہیں ہیں۔ یہ استدلال جمال برھانی اور یقین آور ہے وہاں سادہ اور بالکل واضح ہے۔ (۵۳)

یہاں مناسب ہوگا کہ نامور عارف' مرحوم شاہ آبادی کی بات نقل کی جائے۔ آپ فرماتے ہیں۔ ابراھیمؑ نے برھان فطرت کے ذریعے جھوٹے خداؤں کی خدائی کی بھی نفی کی اور خدا کی الوھیت کو بھی ثابت کیا اس لیے کہ نقص' فطرت کی طرف سے ناپسندیدہ ہے' اور افول وغروب نقص ہے۔

پس ناقص' انسان کا رب اور اس کی اصل نہیں ہو سکتا اور وہ وہی **وھی فاطر السموات والارض** ہے کہ سب فطرت اس محبت میں گرفتار ہیں پس وہ رب العالمین ہے۔ پس حضرت خلیل نے ان خداؤں کو نقص کی وجہ سے رد کیا ہے جسے فطرت ناپسند کرتی ہے اور خداوند کی الوھیت کو فطرت کے "کمال سے محبت" کے ذریعے ثابت کیا ہے۔ (۵۴)

۳۔ اچھائیوں اور برائیوں کے اصول کا ادراک:۔

قرآنی نقطہ نظر کے مطابق انسان کی فطری معرفتوں میں سے ایک' اس کی خوبی اور بدی کے اصول کی معرفت ہے۔ اس مفہوم پر جو آیت سب سے واضح دلالت کر رہی ہے وہ سورہ شمس کی آیت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا

نفس انسانی کی قسم اور اسے موزوں اور معتدل تخلیق کرنے والے کی قسم' پس بدی اور اچھائی کا اس کی طرف اس (اللہ) نے الھام کر دیا۔ (۵۵)

اس آیت میں الھام، یعنی اسے نیکی اور بدی کے افعال کا خدا کی طرف سے سکھا دینا موزوں اور معتدل نفس پر "فرع" قرار دیا گیا ہے۔ یعنی نفس انسان کی تخلیق اس طرح کی گئی ہے کہ وہ خوبی اور بدی کو درک کرتا ہے اور یہ ادراکات بلاواسطہ خدا کی طرف سے انسان پر الھام کیا گیا ہے۔ یہ حس، فکر یا دین کی تعلیم کے ذریعے حاصل نہیں ہوتی۔ البتہ دینی تعلیمات اس بارے میں یادھانی کا کام کرتی ہیں۔

اس مفہوم پر وہ آیات بھی گواہ ہیں جو فلسفہ نبوت، اور دینی اوامرو نواہی کو تذکر، موعظہ اور پند و نصیحت قرار دیتی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالعَدلِ وَالاِحسَانِ وَ اِیتَاءِ ذِی القُربٰی وَ یَنھٰی عَنِ الفَحشَاءِ وَالمُنکَرِ وَالبَغیِ یَعِظُکُم لَعَلَّکُم تَذَکَّرُونَ

خدا، عدل، نیکی اور اپنے رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے اور فحشاء اور منکر چیزوں سے روکتا ہے اور اسطرح تم کو وعظ و نصیحت کرتا ہے تاکہ تمہیں یاد آوری ہو سکے۔ (۵۶)

ایک دوسری آیت میں پیغمبر گرامی کا تعارف "متذکر" اور "یاددھندہ" کے عنوان سے کرایا گیا ہے۔

فَذَکِّر اِنَّمَا اَنتَ مُذَکِّرٌ

یاد دھانی کراؤ۔ آپ صرف یاد دھانی کرانے والے ہیں۔ (۵۷)

مندرجہ ذیل آیات میں بھی آنحضرت کی رسالت کو تذکر اور یاد دھانی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

کَلَّا اِنَّہٗ تَذکِرَۃٌ

قرآن موعظہ اور نصیحت ہے۔ (۵۸)

اسی طرح ارشاد ہے کہ قرآنی آیات حق و باطل کی یاد دھانی کرانے والی ہیں۔

کَلَّا اِنَّہَا تَذکِرَۃٌ

قرآنی آیات حق و باطل کی یاد دھانی کرانے والی ہیں۔ (۵۹)

سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِن ہُوَ اِلَّا ذِکرٰی لِلعَالَمِینَ

نہیں ہے قرآن مگر دنیا کو یاد دلانے والا۔ (۶۰)

وہ آیات جن میں فلسفہ پیامبر اکرمؐ اور فلسفہ تعالیم و احکام قرآن انسانی تذکر اور یاد آوری قرار دیتی ہے بہت زیادہ ہیں اور مذکورہ سطور میں پیش کئے گئے (آیات) ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

تذکرہ والی آیات کو مندرجہ ذیل صورت میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پیغمبر گرامیؐ کی نبوت عام اور جہانی ہے۔
۲۔ نبوت کی غرض و غایت افراد کو حق و باطل اور نیکی اور بدی کی نسبت تذکر اور یاد آوری ہے۔
۳۔ تذکر اور یاد آوری وہاں ہوتی ہے جہاں فرد یا افراد کسی چیز کو پہلے سے جانتے ہوں لیکن اس کو بھلا بیٹھے ہوں یا اس پر عمل پیرا نہ ہوتے ہوں۔
۴۔ انسانی معاشرے میں ایسے افراد بھی تھے اور ہیں جو آسمانی شریعتوں کے منکر ہیں اور اصول حق، باطل اور نیکی اور برائی کو پیغمبران الٰہی اور شرائع آسمانی کے ذریعے انہوں نے حاصل نہیں کئے۔
۵۔ بنا بر این ان حقائق کی معرفت کی بنیادیں انسان کی خلقت اور فطرت میں موجود ہیں۔

جی ہاں! موعظہ اور تذکر سے بہرہ مند ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان خود پرستی اور بے جا ضد چھوڑ دے اور اس کے باطن میں خشیت الٰہی تجلی کرے اسی لئے بعض قرآنی آیات میں پیغمبر گرامیؐ کی رسالت کا ہدف اصل خشیت اور اصل تقویٰ کا تذکر قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَخْشٰیهَا

آپ صرف ان کو ڈرا سکتے ہیں جو قیامت سے) ڈرنے والا ہو۔ (۶۱)

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ فِی ذٰالِکَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَخْشٰی

کہ موسیٰ و فرعون کی داستان میں اہل خشیت افراد کے لئے عبرت ہے۔ (۶۲)

یعنی انسان عذاب اور بد بختی سے ڈرے چونکہ عذاب اور شقاوت سے ڈرنا فطری احساس اور ادراک ہے۔ بنا براین جو اپنی فطرت سلیم کی پیروی کرے گا وہ رسالت کی نصیحتوں سے بہرہ مند ہو گا۔ (۶۳) (باقی آئندہ)

***

حوالہ جات

۱۔ سورہ النحل ۷۸ ۲۔ مومنون ۷۸ ۳۔ السجدہ ۹
۴۔ راغب اصفہانی، مفردات، ص ۴۴۲ ۵۔ تفسیر المنار، ج ۱، ص ۱۴۵، طبع دار المعرفہ
۶۔ ق، ۳۷ ۷۔ ملک، ۱۰ ۸۔ تفسیر المیزان، ج ۱۸، ص ۳۵۶
۹۔ مفردات راغب، ص ۳۸۴، کلمہ فکر ۱۰۔ ن، مصدر ص ۳۴۲، کلمہ عقل
۱۱۔ ن، مصدر، ص ۴۴۶، کلمہ لب ۱۲۔ انفال، ۲۲ ۱۳۔ یونس، ۱۰۰
۱۴۔ الحشر ۲۱ ۱۵۔ آل عمران، ۱۹۰ ۱۶۔ ق، ۳۷

۱۷۔ اعراف، ۱۷۹ ۱۸۔ حج، ۴۶ ۱۹۔ محمد، ۲۴

۲۰۔ احزاب، ۱۰ ۲۱۔ غافر، ۱۸ ۲۲۔ مفردات راغب ص ۴۱۱ کلمہ قلب

۲۳۔ بقرہ ۲۲۵ ۲۴۔ المیزان، ص ۲۲۳ ۔ ۲۲۴

۲۵۔ تفسیر المنار، ج۱، ص ۳۵۲، طبع بیروت ۲۶۔ ھود، ۱۲۰

۲۷۔ قصص، ۱۰ ۲۸۔ الشمس، ۷، ۶ ۲۹۔ عنکبوت، ۶۹

۳۰۔ طلاق، ۲۔۳ ۳۱۔ انفال، ۲۹ ۳۲۔ ابن فارس، مقاییس اللغۃ ج ۶، ص ۹۳

۳۳۔ مفردات راغب ص ۵۱۵ ۳۴۔ فصلت ۱۲ ۳۵۔ فصلت ۱۲

۳۶۔ النحل ۶۸ ۳۷۔ قصص ۷ ۳۸۔ مائدہ ۱۱۱

۳۹۔ یوسف ۱۵ ۴۰۔ انعام ۱۲۱ ۴۱۔ نساء ۱۶۳

۴۲۔ نھایہ ابن اثیر، ج ۳، ص ۴۵۸ ۴۳۔ روم، ۳۰

۴۴۔ آل عمران ۱۹ ۴۵۔ آل عمران ۸۵

۴۶۔ توحید، صدوق باب ۵۳، ص ۳۲۸ ۴۷۔ قیامت، ۱۴۔۱۵

۴۸۔ مجمع البیان ج۹۔۱۰، ص ۳۶۶، طبع بیروت ۴۹۔ سورہ بقرہ ۱۶۵

۵۰۔ انعام ۷۶ ۵۱۔ النحل ۹۶ ۵۲۔ الشوری ۳۶

۵۳۔ المیزان، ج ۷، ص ۱۸۵ ۔ ۱۸۶

۵۴۔ الانسان و الفطرۃ، ص ۲۴۵ ۔ ۲۴۸ نقل از کتاب مبداء و معاد، جوادی آملی ص ۱۰۱۔۱۰۲

۵۵۔ الشمس ۷ ۵۶۔ النحل ۹۰ ۵۷۔ غاشیہ ۲۱

۵۸۔ مدثر ۵۴ ۵۹۔ عبس ۱۱ ۶۰۔ انعام ۹۰

۶۱۔ نازعات ۴۵ ۶۲۔ نازعات ۲۶ ۶۳۔ المیزان ج۲، ص ۱۸۹

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو (ان سے کہو کہ) میں قریب ہوں۔ پکارنے والے کی پکار پر میں اسے جواب دیتا ہوں۔ پس وہ میری دعوت کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لے آئیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔ (البقرہ، ۱۸۶)